

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

حکومت اور فرمانروائی اور غلبہ و استیلا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ۔ دوسری سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اسی کے تعلیمات، اُسی کے معتقدات، اُسی کے نظریات و ماغوں پر چھا جائیں۔ دینیوں اسی کے سانچے میں ڈھلیں۔ تہذیب اسی کی تہذیب ہو۔ علم اسی کا علم ہو۔ اسی کی تحقیق و تحقیق ^{مطالعہ} کھجائے۔ اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھہرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی قوتوں کے اعتبار سے اتنی قوی باز د ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار رکھ سکیں اور کئی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل ثروت پر قابض اور ان کے منظم مملکت پر حاوی ہو جائے۔

اس کے مقابلہ میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت اور دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجئے جو اوپر غلبہ کی دونوں قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو۔ اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو۔ لیکن فطری

قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی، اور تحقیق و انکشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم فکر و تدبیر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی منزل میں بھی متبلا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے تو کا، اور مغلوبیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لئے ذہنی و مادی حیثیت سے در ماندہ اور ضعیف قومیں اپنی ورمانگی و ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں، اسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لئے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں، اور طاقتور۔۔۔ ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے طاقتور۔۔۔ قومیں ان کے دماغ اور ان کے جسم و دنوں پر حکمران ہو جاتی ہیں۔

مسلمان آج کل اسی دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسموں کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں۔ اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔۔۔ قیمتی سے اس وقت کوئی اسلامی باور ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی و غلامی اور خود اختیاری نصیب بھی ہے، وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے مدرسے، ان کے بازار، ان کی سوسائٹی، ان کے گھر حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دیتے ہیں۔ کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ بہر صورت یہ مغرب و عند ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے، اور وہ باطل۔ جس کو مغرب باطل قرار دیا ہے حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی، ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے، اسے

دوست سمجھتے ہیں مٹین ہوتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی اور چھینچھینچ سے معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کوئی دل میں گھٹتا ہے اور گوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔ جب ہماری آزاد قوموں کا یہ حال ہے، تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا کیا پوچھنا۔

اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لئے ایک کتاب کی دست درکار ہے مگر مختصراً اس کو چند نکتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

ذہنی غلبہ و استیلا کی بنا، دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، وہی دنیا کی رہنما بن جاتی ہے، اور اسی کے افکار دنیا پر چھابجاتے ہیں۔ اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں، بلکہ کسی دوسری مجتہد و محقق قوم کے طاقتور افکار و معتقدات کا سیلاب ان کو خود اپنی جگہ پر بھی نہیں ٹھیرنے دیتا۔ مسلمان جب تک محقق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے، تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوع انسانی کے افکار پر غالب رہی جن اور مسیحی اور بدی غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا، اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی مگر جب انہوں نے اس راہ پر فکر اور اصحاب تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے، تب انہوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا۔ جب وہ کتاب علم کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انہوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفا دیدیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں آگے بڑھیں۔ انہوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا۔

انہوں نے کائنات کے راز ٹھونے، اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے، اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں، اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے سر قلم خم کرنا پڑا جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پینچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے، اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ بند کے ماتے انھیں ملتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ کبھی یورپ قلم اور تلوار دونوں مسلح ہے، اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے ایک چھوٹی سی جماعت نے مدافعت کی کوشش کی مگر قلم کا زور تھا نہ تلوار کا۔ ٹیکٹ پر شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سوا اور اعظم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا جو ہمیشہ سے کمزوروں کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، علمی شواہد کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب سے آئے، آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیوں نے ان کو ایمان کا درجہ دیا۔ پرانے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، اور تمدنی آئین جو محض روایتی بنیادوں پر قائم رہ گئے تھے، اس نئے اور طاقتور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے۔ اور ایک غیر محسوس طریقے سے دلوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے، اور وہی محنت و دوستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس

آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں، اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اور بد قسمتی سے مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیتہً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ وہ پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد و لائزہمی اور مادہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ جس تاریخ پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہو گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کائنات کے آثار کا شاہدہ، ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت ان کے مظاہر پر غور و فکر اور ان کو ترتیب دیکر قیاس و برہان کے ذریعہ سے تلخ کا استنباط، کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے، مگر سواد اتفاق سے نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی تحریک رونما ہوئی تو اس تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا، اور یہ سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی تحقیقات اور فکری اجتہاد سے، ان بنیادوں میں ذرا سا بھی تسزل واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پونہ خاک ہو جائیگی۔ اس غلط خیال کے زیر اثر انہوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کے روکنے کے لئے قوت سے کام لیا، مذہبی عدالتیں (Inquisitors) قائم کی گئیں۔

جن میں اس تحریک کے علمبرداروں کو سخت دشنام اور ہولناک سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی، اس لئے تشدد سے دینے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی جتنی کہ حریت فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

ابد میں لڑائی حریت فکر کے علمبرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان تھی۔ مگر چونکہ وہ پیشوا، مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے، اس لئے بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحیت اور آزادی خیال کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد نفس مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مقابل بن گیا۔ سائینک طریقہ پر سوچنے کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ طریق فکر مذہبی طریق فکر کی عین سند ہے۔ جو شخص اس طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہو گیا کہ مذہبی نظریہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریہ کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالم طبیعت کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت، کسی ایسی طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا، اس لئے جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا، یا کسی فوق الطبیعت (Supernatural) ہستی کو فرض کئے بغیر کائنات کے معجزے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اور ہر اس طریقہ کو خلاف حکمت (Unscientific) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہل حکمت فلسفہ میں خدا، اور روح یا روحانیت، اور فوق الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا، جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ سراسر عذبات کی برائی نگہنگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لئے تبریٰ نہ کرتے تھے کہ دلائل و برہین سے اس کا عدم وجود اور عدم وجود ثابت ہو گیا تھا؛ بلکہ وہ اس سے اس لئے بیزار تھے کہ وہ ان کے اور ان کی آزادی خیال کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں

ان کی عقل و فکر اور ان کی علمی جدوجہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد میں ہی غیر عقلی جذبہ تھا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو ان کا رخ خدا پرستی کے بائیں مخالف سمت میں تھا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ خدا پرستی سے قریب تھے اور یہجیرت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ بنا کر چاہتے تھے، مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے یہجیرت خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالم طبیعت سے بالاتر ہو ان سے بائیں ہو گیا، اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادہ و حرکت کے سوا کوئی شے ان کے نزدیک حقیقی نہ رہی۔ سائنس یہجیرت کا ہم معنی قرار پایا۔ اور اہل حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہو گیا کہ ہر چیز جو قابل حساب و پیمائش نہیں ہے، اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ و سائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈیکارٹ Descartes، ہٹونفی ۱۶۵۰ء جو مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے، اور مادہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے، مگر دوسری طرف وہی فلسفی ہے جس نے عالم طبیعت کے آثار کی توجیہ میکانکی (Mechanical) طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریق فکر کی بنا رکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابز (Hobbes) ۱۶۶۹ء اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا ہے۔ وہ فوق طبیعت (Supernatural) کی حکم کھلا مخالفت کرتا ہے، نظام عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہ کے قابل قرار دیتا ہے، اور کسی ایسی نفسی یا روحی یا عقلی قوت کا قائل نہیں ہے جو اس مادی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے اس حیثیت سے کہ ایسی ایک علت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانہ میں اسپینوزا Spinoza

۱۶۷۰ء کا اٹھا جو سترہویں صدی میں عقلیت Rationalism اکا سب سے بڑا علمبردار تھا مگر اس نے مادہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کل بنا دیا، اور اس کل میں خدا کے اختیار مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لامنتزاد (Leibniz) ۱۶۷۰ء اور لاک (Locke) ۱۶۸۷ء بھی خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔ یہ سترہویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اسی طرح سائنس نے بھی سترہویں صدی تک کابل الہی دکازنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ کوپرنیکس (Copernicus) کپلر (Kepler) گیلیلیو (Galileo) نیوٹن (Newton) اور نیوٹن کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا شکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے، جو اس نظام کو چلا رہی ہیں، اور ان قوانین کو معلوم کرنے کے خواہشمند تھے جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الہی نظریہ سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اس پرستی اور نیچریت کا تخم تھا جو بعد میں حریت فکر کے درخت سے پیدا ہوئی، لیکن سترہویں صدی کے حکماء کو اس شعور نہ تھا۔ وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خط امتیاز نہ دیکھ سکتے، اور یہی سمجھتے رہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ بچھ سکتی ہیں۔

انھارویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظام کائنات کی جستجو کرے گا۔ وہ مادیت بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ (John Toland) ڈیوڈ ہارٹلی (David Hartley) جوزف پریسٹلی (Joseph Priestley) اولٹیئر (Voltaire) لامیٹری (La Mettrie) ہولباخ (Holbach) کیبانیس (Cabanis) ڈینس ڈائیڈروٹ (Denis Diderot) مونتسکیو (Montesquieu)

روسو (Rousseau) اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ و حکما پیدا ہوئے جنہوں نے
 یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا، یا اگر بعض نے اسے تسلیم کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرائض
 Constitutional Monarch سے زیادہ نہ سمجھی جو نظام کائنات کو ایک مرتبہ
 میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہو گیا ہے اور اب اس نظام کے چلنے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ لوگ
 عالم طبیعت اور دنیا کے مادہ و حرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے، اور ان کے
 نزدیک حقیقت صرف انہی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہیں۔ ہیوم (Hume)
 نے اپنی تجربیت (Empiricism) اور فلسفہ تشکیک (Scepticism) سے اس طریق
 فکر کی زبردست تائید کی، اور عقولات کی صحت کے لئے بھی تجربہ ہی کو معیار قرار دیتے پورے زور دیا۔ کچھ
 Berkeley نے مادیت کی اس بڑھتی ہوئی رو کا جانتوڑ مقابلہ کیا مگر وہ اس کو نہ روک سکا
 ہیگل (Hegel) نے مادیت کے مقابلہ میں تصوریت (Idealism) کو فروغ دینا چاہا
 مگر ٹھوس مادے کے مقابلہ میں لطیف تصور کی پرکشش نہ ہوئی۔ کانٹ (Kant) نے بیچ کی
 راہ یہ نئی راہ خدا کی ہستی، روح کا بقا، اور ارادہ کی آدوسی ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو ہمارے
 علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں عانی نہیں جاسکتیں۔ تاہم ان پر ایمان لایا جاسکتا ہے، اور حکمت عملی (Practical reason)
 اس کی تقاضی ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے
 درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی لیکن ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب عقل و فکر کی گمراہی نے خدا کو محض
 وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک معطل اور بے اختیار ہستی قرار دے لیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لئے
 اس کو ماننا، اس سے ڈرنا، اور اس کی خوشنودی چاہنا، سراسر ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔

انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوگت (Vogt) بوخنر (Buchner)

تو پے Czolbe کومت (Comte) موکشات (Moleschott) اور ووسر کے حکماً و نلاسف نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفہ میں تجرّبت اور اخلاق میں افادیت (Utilitarianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقاویت اور نظام کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہوجانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology) عضویات (Phytology) ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology) کے اکتشافات، عملی سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں رائج کر دیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ لگے بندے قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ کوئی اس کو چلانے والا اور ان قوانین کو نافذ کرنے والا نہیں ہے۔ آپ ترقی کے منازل سے طے کرتی رہی ہے۔ کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادے میں جان کہیں باہر سے نہیں ڈالی جاتی بلکہ خود مادہ اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے، تو اس میں جان پڑ جاتی ہے، نو حرکت ارادہ، احساس، شعور، فکر، سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ جو ان اور انسان سب کے مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ نہیں ہے۔ ان کے نظام کا درہم برہم ہو جانا، ان کی آخری کاخرج ہو جانا ہی ان کی موت ہے، جو فنا کے معنی کی ہم معنی ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔ اب ان کے فے حشر اور بار دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اس نحریت اور مادیت کو استحکام بخشے، اور ایک مدلل اور منظم

علمی نظریہ کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع Origin of species اور ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسے طریق استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹیفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا محکم ترین طریقہ تھا، اس نظریہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ کائنات کا کاروبار خدا کے ہاتھ سے چل سکتا ہے، آثار و مظاہر فطرت کے لئے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علت کی حاجت نہیں۔ زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لیکر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقاء ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل و حکمت کے جوہر سے عاری ہے۔ انسان اور دوسری انواع جو انی کو پیدا کرنے والا کوئی خاص حکیم نہیں ہے، بلکہ وہی ایک جاندار میں جو کبھی کبڑے کی شکل میں ریگاکرتی تھی، تنازع البقار، اور انتخاب طبیعی کے نتیجہ کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہو گئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ کسی علیم و قید خدا کے خون کی گنجائش ہے، نہ نبوت اور وحی و الہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کی دوسری صورتوں کا تصور، نہ حیات دنیا کے حساب کتاب کا کوئی کھٹکا نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال۔ نہ زندگی کے جو انی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی صداقت پسندی حق جوئی، حسن اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، چاہ پرہیزگاری، اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا ماتہ اس ماتہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے، اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے، ان کو بہ تہذیب و تمدن سے اکھاڑ روینا چاہتی ہے۔ اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی

عمارت قائم کرتی ہے، ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھیر سکتی۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا اسے لا محالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ تہذیب اپنی مادہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں راکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار، اور حاکمانہ استبداد سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور ظلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے، ان کے لئے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعب و داب سے محفوظ رہتے خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہ راست کسی مغربی سلطنت کے زیر حکم آگئے تھے۔ ان کو اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کے لئے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے۔ اور چونکہ یہ تحصیل علم، خاص تحصیل علم کی خاطر نہ تھی، اور مزید برآں ایک مرعوب و ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب، نہ کیا گیا تھا، اس لئے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی انداز اور سائنٹیفک نظریات کا اثر قبول کر لیا، ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں، ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ پیدا ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ خود غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ مستزلزل ہو گئی ہیں ذہنیوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے جس سے

اسلامی طریق پر سوچنا اور سمجھا جاسکتا تھا مغربی طریق پر سوچنے، اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروع میں طرح طرح کے شہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابل تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ مغربی انداز اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے نفرت ہو رہی ہے اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلا سے قطع نظر، مغرب کا علمی اور فکری دباؤ و تسلط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لئے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لئے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ مشکل اس وقت تک دور نہ ہوگا۔ جب تک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر پیدا نہ ہوں گے۔ اسلام میں ایک نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پر لے اسلامی مفکرین و محققین کا

سوا یہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے اس کو اب اٹنے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے جن سے وہ چھ سو برس پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھادیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ قرآن کے بنائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو، ایک نئی حکمت طبعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے، لہذا نہ نظریہ کو توڑ کر آہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اس

تمام کریں اور اس صبیحہ کو تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور اس میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

یہ جو کچھ کیا گیا ہے اس کے مقصد وہ مادہ کو تیش کے پیرایہ میں یوں سمجھے کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں جو لوگ اس میں بیٹھے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر کوئی مسافر اس راہ پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رخ آگے کے بجائے پیچھے یا دائیں یا بائیں پھیر دے۔ مگر نشست کا رخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رخ بدلنے کی سعادت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے۔ اور اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور فکر اسلامی سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے گاڑی اپنے مسافروں کو لئے ہوئے الحاد اور مادہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزل مقصود سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اب اس رفتار کو بدلنے کے لئے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مردِ صالحین اور جدوجہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا گاڑی کا رخ نہ بدلے گا اور ہمارے جھنجھلائے بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔